خدا ہماری مدد کرے کہ ہم خود بھی درست ہوں اور اُن اسلاف کی اولاد کو بھی ٹھیک کریں جو ہمارے محسن تھے!

پوتے کی محرومیِ وراثت

سوال:- (۱) دادا کی زندگی میں اگر کسی کا باپ مرجائے تو پوتے کو وراثت میں سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ مشہور شرعی مسئلہ ہے جس پر اس وقت حکومت کی طرف سے عمل ہورہا ہے اس بارے میں مختلف مسلک کیا ہیں اور آپ کس مسلک کو مزاج اسلامی سے قریب تر خیال فرماتے ہیں۔ اگر آپ کا مسلک بھی مذکورہ ہی ہے۔ تو اس الزام سے بچنے کی کیا صورت ہے کہ اسلامی نظام جو یتیم کی دستگیری کا اس قدر مدعی ہے، ایک یتیم کو محض اس لیے دادا کی وراثت سے محروم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو دادا کی وفات سے بعد تک زندہ نہ رکھ سکا۔

(۲) مالِ غنیمت میں لونڈیوں کی تقسیم کا مسئلہ۔

(ا) لونڈیوں کے بارے میں حکم جاری ہے۔ یا منسوخ ہوچکا ہے؟

(ب) لونڈیوں کی تقسیم کے لیے اگر معاشرتی ضروریات متقاضی تھیں تو کیا اس کا دوسرا حل ممکن نہ تھا؟

(ج) لونڈیاں صرف اُن عورتوں کو بنایا جاتا تھا جو مسلمانوں کے لیے مردوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے آتی تھیں یا گھر میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو بھی لاکر لونڈیاں بنایا جاتا تھا؟

(د) کیا یہ صورت فریقِ مقابل کی قومی توہین قرار نہیں دی جاسکتی؟ اور کیا یہ صورت دوسرے فریق کے دلوں میں اسلام سے نفرت کا باعث نہیں بنتی؟ اور کیا اس سے وہی صورت واقع نہیں ہوگی جو آج ہمارے اور ہندوؤں کے درمیان گزشتہ فسادات

کی وجہ سے موجود ہے؟

(۳)- اگر یہ حکم اب بھی اسی طرح ہے تو ہندوستان سے جنگ کی صورت میں مسلمان عورتوں کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اپنے وطن کے تحفظ کے لئے ہمارے ہندوستانی بھائی ہمارے خلاف ضرور صف آرا ہونگے؟

(۴) کیا لونڈیوں سے قوم میں شہوانی جذبات ترقی پذیر نہیں ہوتے؟ اور آئندہ کیا گارنٹی اس امر کی ہے کہ ان کی عدم موجودگی میں جذبات پر قابو پایا جاسکے؟ شہوانی جذبات کی اس فراوانی اور حیوانیت کے اس غلبہ کو اسلام کا مزاج تو پسند نہیں کرسکتا۔

جواب:- (۱) فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اسمیں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے۔ لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کردیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ پوتا بہر حال اپنے باپ کے واسطے ہی سے دادا کے مال میں حق دار ہوسکتا ہے نہ کہ براہ راست خود۔ اسی طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے سے خسر کے مال میں سے حصہ پاسکتی ہے نہ کہ براہ راست خود۔ اگر ایک شخص کا بیٹا اس کی زندگی میں مرجائے اور وہ شادی شدہ نہ ہو، تو آپ خود مانیں گے کہ اس کا حصہ ساقط ہوجائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ اس شخص کے مرنے پر اس کے ترکہ میں سے اس کے فوت شدہ بیٹے کا حصہ بھی نکالا جائے اور پھر اس کی میراث اس کی ماں اور اس کے بھائیوں وغیرہ کو پہنچائی جائے۔ اسی طرح اگر اس فوت شدہ لڑکے کی کوئی بیوی موجود ہو تو آپ خود مانیں گے کہ وہ اپنے خسر کے ترکہ میں سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نکاح ثانی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو

پھر آپ کو کیوں اصرار ہے کہ صرف اس کا بیٹا موجود ہونے کی صورت میں اس کا حصہ ساقط نہ ہو بلکہ وہ اس کے بیٹے کو پہنچے؟

رہا یتیم کی پرورش کا سوال، تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں، اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں۔ نیز شریعت نے وصیت کا حکم اسی لیے دیا ہے کہ اگر کوئی مرنے والا اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو اور اس کے خاندان میں کچھ لوگ مستحق موجود ہوں تو وہ ان کے حق میں وصیت کرے۔ ⅓ حصہ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے۔ اور اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر وہ کوئی یتیم پوتا چھوڑ رہا ہے، یا کوئی بیوہ بہو چھوڑ رہا ہے جو بے سہارا ہو، یا کوئی بیوہ بھاوج یا غریب بھائی یا بیوہ بہن چھوڑ رہا ہے تو ان کے لیے وصیت کر جائے۔ یہ گنجائش اسی لیے رکھی گئی ہے کہ قانونی وارثوں کے سوا خاندان میں جو لوگ مدد کے محتاج ہوں ان کی مدد کا انتظام کیا جا سکے۔

۲۔ لونڈیوں کے بارے میں میں اپنی کئی کتابوں میں مفصل بحث کر چکا ہوں۔ آپ میری کتاب تفہیمات حصہ دوم اور "رسائل و مسائل" ملاحظہ فرمائیں۔ نیز تفہیم القرآن میں سورۂ نساء کے حواشی دیکھیں۔ امید ہے کہ آپ کے تمام شبہات دور ہو جائیں گے۔ پھر بھی اگر کوئی شبہ رہ جائے تو آپ لکھ کر مجھ سے پوچھ سکتے ہیں۔

تعلیم قرآن کے لیے تفسیروں کے بجائے "پروفیسر"

سوال: میں مدرسہ مظاہر العلوم کا فارغ التحصیل ہوں۔ میرا عقیدہ علمائے دیوبند و مظاہر العلوم سے وابستہ ہے مگر ساتھ ساتھ اپنے اندر کافی وسعت رکھتا ہوں۔ جہاں مجھے بھلائی معلوم ہو جائے وہاں حتی الامکان اس میں حصہ لینے کا رجحان رکھتا ہوں۔ اسی وجہ سے جماعت اسلامی کے ساتھ قلبی ربط رکھتا ہوں، اخبار کوثر اور لٹریچر کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں، مولانا ابواللیث کی زندگی کو

قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ علمائے دیوبند اور آپ کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہو گئی ہے اس کا بھی مجھے علم ہے۔ اور اس کی وجہ سے میری طبیعت پریشان ہے۔ میں نے ترجمان القرآن کے وہ شمارے پڑھے ہیں جن میں حکیم گنگوہی صاحب کے اعتراضات کے جوابات آپ نے بنفس نفیس اور مولانا امین احسن صاحب نے دیئے ہیں۔ انہیں پڑھتے ہی میں نے حضرت استاذ مفتی....

.... کی خدمت میں جوابی لفافہ بھیجتے ہوئے لکھا کہ میری نظر میں ایک ہی جماعت اسلامی موجودہ وقت میں حزب اللہ معلوم ہوتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کام کروں، مگر ساتھ ساتھ معلوم ہوا کہ آپ حضرات کو جماعت اسلامی سے شدید اختلاف ہے۔ لہٰذا آپ مولانا مودودی کے وہ خیالات ان کی کتابوں سے نقل فرمائیں جو اہل سنت والجماعت کے خلاف ہوں۔ چنانچہ انہوں نے "کشف الحقیقۃ" نامی رسالہ بھیج دیا۔ میں اس کا مطالعہ کر چکا ہوں۔

اس رسالے میں چند ایسی عبارات درج ہیں جن کے متعلق مجھے بھی اشتباہ ہوا۔ چنانچہ میں نے تفہیمات حاصل کی اور اس میں وہ عبارات مل گئیں جو مفتی صاحب نے نقل کی تھیں۔ اب میں ان عبارات کے متعلق آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ کی ان سے مراد کیا ہے۔ آپ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر جواب دیں تاکہ میرے اور میرے دو تین رفقاء کے شکوک رفع ہو سکیں۔ اس وقت تفہیمات میرے سامنے موجود ہے اور قابل غور عبارات یہ ہیں:-

(۱) "قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو" (ص ۱۹۳)۔ ساری عبارت نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ واضح فرمائیے کہ اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟ نفی تفسیر سے کونسی تفسیر کی نفی مراد ہے؟ کیا اس تفسیر کی نفی مراد ہے جو اسرائیلیات پر مشتمل ہو؟ یا موضوع حدیث سے کسی آیت کی تفسیر کی گئی ہو؟ اور پروفیسر کو غائر مطالعہ کیا بغیر احادیث و آثار صحابہ

و تابعین سے حاصل ہو سکتا ہے ؟ یا اگر نہیں حاصل ہو سکتا ہے تو تفسیر کی حاجت کیوں نہیں ؟

(۲) "قرآن اور سنت رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں" (ص ۴۱۳) اس عبارت کو خواہ ماقبل و مابعد سے ملایا جائے یا قطع و برید کر کے الگ کیا جائے، بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم و احادیث نبویہ کی تعلیم مفسرین و محدثین حضرات کی تعلیم سے نہ لی جائے، بلکہ براہ راست ان سے مطالب اخذ کیے جائیں۔ اگر یہ مطلب ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ صحابۂ کرام کو بھی براہ راست اخذ مطالب کی اجازت نہ تھی، بلکہ وہ بھی محتاج تفسیر رسول تھے۔ بعض صحابہ نے بعض آیات کے مطالب سیکھ لیے۔ تو پھر آج کس طرح بغیر تفسیر مفسرین متقدمین قرآن حکیم کے مطالب اخذ کئے جا سکتے ہیں ؟ اس مقام پر اگرچہ آپ نے یونیورسٹی کو مخاطب کیا ہے مگر ان کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ قرآن و سنت رسول کی تعلیم کو لازم قرار دے کر ان کے مطالب بغیر تفسیر و حدیث کے متقدم ذخیروں کے اخذ کریں۔ کیا بچہ بغیر والدین کے خود بخود بولی سیکھ سکتا ہے ؟ بہر کیف اگر یہ مطلب ہو جو بظاہر صاف معلوم ہوتا ہے تو بجائے اصلاح کے بہت نقصان دہ ہے۔

(۳) "وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کیے جائیں جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوتے ہیں۔" آپ کا کیا خیال ہے کہ شامی وغیرہ کتب فقہ میں اسلامی قوانین نہیں لکھے ہوئے ہیں ؟ کیا وہ فقہائے اسلام کے خود ساختہ قوانین ہیں جو کہ قرآن و حدیث کے مخالف ہیں ؟ بہر کیف اس کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے ؟ ان کتابوں میں یقیناً بعض ایسے مسائل ہیں جو مرجوح ہیں مگر ان سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان میں سارے مسائل قوانین اسلام کے خلاف ہیں۔ کیا ان میں جزئیات کے علاوہ مسلمانوں کی تنظیم اور اتحاد وغیرہ کا ذکر بسیط نہیں ہے ؟ اگر ہے تو ان میں کیا کمی ہے ؟

امید ہے کہ تکلیف فرما کر ہمیں اطمینان دلائیں گے !

جواب: - میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ میری جن عبارات سے آپ کے دل میں شبہ پیدا ہوا تھا ان کا مفہوم آپ نے خود مجھ ہی سے دریافت فرما لیا۔ اہل حق کا یہی طریقہ ہے کہ قائل کی مراد پہلے خود قائل ہی سے پوچھی جائے، نہ یہ کہ بطور خود ایک مطلب لیکر اس پر فتویٰ جڑ دیا جائے۔

عبارات ۱ و ۲ سے میری مراد کیا ہے، اس کو سمجھنے میں آپ کو اور آپ جیسے دوسرے لوگوں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ لوگ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ماحول سے، ان کے نصاب تعلیم سے، اور ان کے اندر گمراہی کی پیدائش کے بنیادی اسباب سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ آپ لوگ ان درسگاہوں کو اپنے دینی مدارس پر قیاس کرتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ جس طرح آپ کے مدرسوں میں کوئی مولوی صاحب آسانی سے بیضاوی اور جلالین اور ترمذی پڑھا لیتے ہیں اسی طرح ان کالجوں میں بھی پڑھا سکتے ہونگے۔ اسی لیے آپ کو میری یہ بات بڑی انوکھی معلوم ہوئی کہ میں تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کے بجائے ان کا کوئی بدل ان کالجوں کے لیے تجویز کر رہا ہوں لیکن میں آپ کے دینی مدارس کی طرح ان کالجوں اور یونیورسٹیوں سے بھی واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں کس قسم کا ذہنی ماحول پایا جاتا ہے اور ان کے طلبہ کن افکار و نظریات کی آب و ہوا میں نشوونما پاتے ہیں۔ میں نے خود ان کتابوں کو پڑھا ہے جو مذہبی تخیل کی جڑوں تک کو انسان کے ذہن سے اکھاڑ پھینکتی ہیں اور سراسر ایک ملحدانہ نظریۂ کائنات و انسان اس طرح آدمی کے ذہن میں بٹھا دیتی ہیں کہ آدمی اسے بالکل ایک معقول نظریہ سمجھنے لگتا ہے۔ میں نے تفسیر قرآن اور شرح حدیث اور فقہ کی پرانی کتابوں کو بھی پڑھا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ جدید زمانے کے علوم پڑھنے والے لوگوں کے ذہن میں شکوک و شبہات کے جو کانٹے چبھے ہوئے ہیں، صرف یہی نہیں کہ ان کتابوں میں ان کو نکال دینے کا کوئی سامان نہیں ہے، بلکہ ان میں قدم قدم پر وہ چیزیں ملتی ہیں جو نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے دل میں مزید شبہات پیدا کر دینے والی ہیں اور بسا اوقات ان کی وجہ سے ایک متشکک شک کے مقام سے آگے بڑھ کر جحود و انکار کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان جدید درسگاہوں میں پرانے طرز کے معلم دینیات اپنے پرانے طریقوں اور ذخیرں

سے دین کی تعلیم دے کر اس کے سوا کوئی خدمت انجام نہ دے سکے کہ خود بھی مضحکہ بنے اور دین کا بھی استخفاف کرایا۔ یہ ساری چیزیں میری نگاہ میں ہیں۔ اسی بنا پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ ان درسگاہوں کے لیے جب تک قرآن کی ایسی تفسیریں اور حدیث کی ایسی شرحیں تیار نہ ہو جائیں جن میں اُن تمام اہم سوالات کا جواب مل سکتا ہو جو نئے زمانے کے علوم پڑھنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اس وقت تک کوئی خاص کتاب داخلِ نصاب نہ کی جائے بلکہ تلاش کر کر کے ایسے استاد رکھے جائیں جو قرآن و حدیث میں گہری بصیرت رکھتے ہوں اور علوم جدیدہ سے بھی واقف ہوں، اور وہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھانے کے بجائے براہِ راست قرآن کا درس دیں اور حدیث کی کوئی شرح پڑھانے کے بجائے براہِ راست احادیث نبوی کی تعلیم دیں تاکہ طلبہ کو اُن بحثوں سے سابقہ ہی نہ پیش آئے جو اُن کے لیے ابتداءً موجب توحش ہوا کرتی ہیں۔

اِس وقت تو پھر بھی کالجوں کا ماحول پہلے سے بہت زیادہ بہتر ہو چکا ہے، مگر جس زمانے میں میں نے "تنقیحات" کے یہ دونوں مضمون "ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص" اور "مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل" لکھے تھے (یعنی ۱۹۳۶ء) اُس وقت تو علی الاعلان دین کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا۔ "نگار" کی طرح کے پرچے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ میں تیزی کے ساتھ الحاد پھیلا رہے تھے اور اشتراکی تحریک وبا کی طرح نوجوان نسل کو متاثر کرتی چلی جا رہی تھی۔ آپ کے مذہبی مدارس میں پڑھنے پڑھانے والوں کو نہ اس صورتِ حال کا کوئی اندازہ تھا اور نہ انہوں نے اپنے وقت کا ایک لمحہ اس مرض کے اسباب کی تشخیص کرنے اور اس کا علاج سوچنے پر صرف کیا۔ میں مدتوں اپنی راتوں کی نیند حرام کر کے اِن مسائل پر غور کرتا رہا اور وقت کے تعلیمی راہنماؤں کے سامنے ان کے نظامِ تعلیم کا پورا تجزیہ کر کے میں نے وہ اسباب صاف صاف پیش کر دیئے جو الحاد کی بڑھتی ہوئی تشویشناک رَو کے اصل موجب تھے۔ اِس کے ساتھ میں نے ان کو یہ بھی بتایا کہ اگر آپ فی الواقع اس الحاد کی پیدائش کو روکنے کے خواہشمند ہیں تو اپنے نظامِ تعلیم میں یہ اصلاحات کیجیے۔ اس سلسلہ میں جب کالجوں میں موزوں دینی نصاب تجویز کرنے کا سوال پیش آیا تو میں نے

اپنی حد تک اُس پورے ذخیرے پر نگاہ ڈالی جو تفسیر قرآن، شرح حدیث اور فقہ و کلام کے موضوعات پر موجود تھا، اور مجھے ایک کتاب بھی ایسی نظر نہ آئی، خواہ وہ اردو میں ہو یا عربی میں یا انگریزی میں، جسے ان درسگاہوں کے لئے تجویز کیا جاسکے ــــ اور اس وقت کیا، میں آج آپ کے ان مفتیوں سے پوچھتا ہوں کہ ذرا کسی ایسی کتاب کا نام لیجیے جسے اطمینان کے ساتھ ان طلبہ کے ہاتھ میں دیا جاسکے ــــ... آخر کار اس پیچیدگی کا حل مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہ آیا کہ سر دست جو چنے گنے چنے آدمی ہماری قوم میں ایسے موجود ہیں جو کالجوں کی مخلوق کو دین کی تعلیم دینے کے اہل ہیں، اُن کی خدمات حاصل کرکے چند مرکزی درس گاہوں میں تعلیم دین کا انتظام کیا جائے پھر جو کھیپ ان کے فیضِ تعلیم سے تیار ہو کر نکلے گی اس میں سے ایسے معلّمین نکل آنے کی توقع کی جاسکتی ہے جو دوسری درسگاہوں کے کام آسکیں اور کالجوں کے لیے موزوں نصاب بھی تیار کرسکیں۔

میری اس تشریح کے بعد اب ذرا آپ پھر تنقیحات کے ان دونوں مضمونوں کو اوّل سے آخر تک پڑھیے۔ اس کے بعد آپ کو اندازہ ہوگا کہ آج پندرہ سال بعد ان مضمونوں کی بو داد مجھے دیوبند اور مظاہر العلوم کے دار الافتاؤں سے ملی ہے وہ کس درجہ علم و بصیرت اور خدا ترسی پر مبنی ہے۔ میں حیران ہوں اگر یہ لوگ اِن معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو آخر کس نے ان پر فرض کردیا ہے کہ ان پر اظہار رائے فرمائیں اور وہ بھی بشکل فتویٰ؟

رہی تیسری عبارت تو اس سے جو شبہ آپ کے دل میں پیدا ہوا ہے اور جو شبہ دیوبند و مظاہر العلوم کے مفتیوں نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی تردید خود اسی مضمون سے ہو سکتی تھی جس میں وہ عبارت واقع ہوئی ہے۔ بشرطیکہ مضمون کو بغور پڑھا جاتا۔ آپ کے پاس اگر تنقیحات موجود ہے تو اس میں وہ مضمون نکالیں جس کا عنوان ہے "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" اسے دیکھیے۔ اور اس نظر سے دیکھیے کہ آیا اس میں مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی معتبر کتابیں کونسی ہیں اور ایک سلطنت میں کونسی فقہ کس طرح جاری ہونی چاہیے، یا یہ ہے کہ موجودہ ترکی

میں الحاد و بیدینی اور اندھی مغربیت کے فروغ پانے کی وجہ کیا ہے؟ اگر کسی شخص میں کسی مضمون کو پڑھ کر اس کا موضوع سمجھنے کی کچھ بھی صلاحیت ہو تو وہ بیک نظر معلوم کر لے گا کہ میرے اس مضمون کا اصل موضوع دوسرا ہے نہ کہ پہلا۔ پھر یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ ایک موضوع پر کلام کرتے ہوئے ضمناً اگر ایک فقرہ میرے قلم سے کسی دوسرے موضوع سے متعلق نکل گیا ہے تو آپ صرف اس ایک ہی فقرے کی بنا پر فیصلہ فرمائیں کہ اس دوسرے موضوع کے بارے میں میرا مذہب و مسلک کیا ہے؟ اور اس پر مزید ستم یہ ہے کہ آپ اس فقرے سے میرا مذہب و مسلک بھی مستنبط فرماتے ہیں تو وہ جس کی تردید میری بیسیوں تحریریں کر رہی ہیں۔ آپ کو اگر یہ معلوم کرنا تھا کہ فقہ میں میرا مسلک کیا ہے اور سلف کی فقہی کتابوں کے بارے میں میری کیا رائے ہے تو آپ کو میری وہ تحریریں دیکھنی چاہییے تھیں جو میں نے فقہ کے موضوع پر لکھی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو صرف میرا وہ رسالہ ہی پڑھ لیتے جو "اسلامی قانون" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، تو آپ کے وہ سارے شبہات رفع ہو جاتے جن کی عمارت تنقیحات کے صرف ایک فقرے پر تعمیر ہوئی تھی۔

اس سلسلے میں اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات میں اور عرض کر دوں۔ علمائے کرام علوم دینیہ میں جیسی کچھ بھی نظر رکھتے ہوں، بہر حال دو چیزیں ایسی ہیں جن سے وہ تقریباً بالکل ناواقف ہیں:

(۱) انہیں کچھ خبر نہیں ہے کہ تہذیب کے زمانہ میں مختلف مسلمان ملکوں میں مغربیت اور اسلامیت کے درمیان کس کس نسبت کی کشمکش ہوئی ہے اور اس میں ہر جگہ اسلامیت کی شکست اور مغربیت کے غلبہ و فروغ کے اسباب کیا ہیں اور اس افسوسناک نتیجے کے رونما ہونے میں خود علماء اور زعمائے دین کی اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا کتنا دخل ہے۔

(۲) انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ دنیا کے موجودہ تمدن میں اگر ہم ایک عملی درجہ کی ترقی یافتہ اسلامی ریاست کا نظام خالص اسلامی اصولوں پر چلانا چاہیں تو ہمیں کس قسم کے مسائل سے سابقہ پیش آئے گا اور ان مسائل کو حل کرنے میں سلف کی چھوڑی ہوئی علمی میراث کس حد تک ہمارے